© rasailojaraid.com

مقالات

تحریر: رفیق حسین نیازی ایڈووکیٹ
متعلم "المعہد العالی للشریعۃ والقضاء" لاہور

اسلامی دستور اور فقہی اختلافات

وطنِ عزیز میں شریعت کی عملداری میں جو رکاوٹیں آج درپیش ہیں، ان سے کچھ کا تعلق تو براہِ راست حکومت سے ہے۔ لیکن اصل رکاوٹ جو ایک بہت بڑے بند کی طرح اس کا راستہ روکے ہوئے ہے وہ مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان پائے جانے والے متنوع فقہی اختلافات ہیں۔ جب کہ چند فرقوں کا اس ضمن میں رویہ بھی متشددانہ ہے۔ حکومت یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ یہ وہ مسئلہ ہے جس کا حل علمِ دین کے دعویداروں اور رہنماؤں کے پاس ہے۔ لیکن علماء ہیں کہ "کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ" کے مصداق اپنی ہی فقہ اور فرقہ پر مُصر ہیں۔ اور اس سے اختلافِ رائے کے بارے میں کوئی ایک لفظ بھی سننے کے روادار نہیں۔ حالانکہ ان سب کا فرض یہ ہے کہ وہ بلاتمیزِ مسلک باہم مل بیٹھ کر اپنے اختلافات کو، جو زیادہ تر فروعی نوعیت کے ہیں کسی ضابطہ کے تحت لانے کی کوشش کریں۔ اور اختلاف رائے برداشت کرنے کا اسلاف کا سا ظرف اور حوصلہ پیدا کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علماء کرام کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے کہ وہ اس مسئلہ کا کوئی فوری حل تجویز کریں، ورنہ ملک میں شریعت کی عملداری کی راہیں اور زیادہ پُرخار اور دشوار ترین ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن افسوس کہ اسلام اور شریعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا اور سب کچھ قرار دینے کے باوجود بھی یہ لوگ اس جانب یکسوئی اور خلوص کے ساتھ توجہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ وہ سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ عالمِ اسلام اور پاکستان تاریخ کے اہم ترین دور سے گزر رہا ہے اور پوری دنیا پاکستان میں شریعت کی عملداری کے تجربہ میں خصوصی دلچسپی لے رہی ہے۔ یہی وہ وقت ہے جس سے فائدہ اٹھا کر وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ صرف اُنہی کے پاس وہ کاملِ نظام موجود ہے جو ساری دنیا کے دکھوں کا مداوا بن سکتا ہے۔ وہ اس حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بھی واقف ہیں کہ اس ضمن میں ذرا سی کوتاہی بھی کامیابی اور کامرانی کی بساط الٹ سکتی ہے۔

فقہی اختلافات میں اس متشددانہ رویہ سے بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ ہمارے موجودہ اختلافات اور تعصبات شریعت کے پیدا کردہ ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے جہاں ان اختلافات اور تعصبات سے بچنے کی تاکید کی ہے، وہاں اُن سے محفوظ رہنے کے لیے راستہ بھی متعین کر دیا ہے جسے اپنا کر ہم اپنے اسلاف کی دیرینہ روایات کو زندہ و تابندہ رکھ سکتے ہیں۔ دراصل ہمارے موجودہ اختلافات اور تعصبات شریعت کی راہ سے انحراف کرنے اور اختلافات سے بچنے کے واحد ذریعہ کتاب و سنت کی پابندی کی بجائے اپنے اپنے نقطۂ نظر اور مسلک کو حرفِ آخر سمجھ لینے کا نتیجہ ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا"

(آل عمران: ۱۰۳)

یعنی "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور آپس میں پھوٹ مت ڈالو"۔

مذکورہ بالا آیت اپنے مطالب و معانی میں بالکل واضح اور کسی تشریح و توضیح کی محتاج نہیں ہے۔ اس میں واضح طور پر مسلمانوں کو اختلافات سے بچنے کی نہ صرف تاکید کی گئی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم دے کر اس سلسلہ میں ایک راہِ عمل بھی متعین فرما دی گئی ہے۔ یہاں اللہ کی رسی سے مراد وہ دستورِ حیات یعنی قرآنِ مجید ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول پر ہمارے لیے آخری ہدایت بنا کر نازل فرمایا ہے۔ اور ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو ہدایات بھی حاصل کریں، وہ اسی الہامی دستور سے حاصل کریں۔ اور اس کی موجودگی میں نہ تو کوئی دستور وضع کریں اور نہ ہی کسی دوسرے دستور کو اس سے اعلیٰ و ارفع قرار دیں۔ بلکہ زندگی میں ہمیں جو بھی الجھن اور مشکل پیش آئے، اسے اسی دستور کی روشنی میں حل کریں ——— ہمارے حق کا معیار وہی ہو جو اس دستور نے قرار دیا ہے اور ہم ہر اس چیز کو باطل سمجھیں جو اس دستور کی رُو سے باطل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مندرجہ بالا آیت میں " لَا تَفَرَّقُوْا " کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس دستورِ حیات یعنی قرآنِ مجید کو چھوڑ کر الگ الگ مسالک کی عصبیت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ یعنی ایسا نہ ہو۔ کہ مسلک کسی امام کی طرف منسوب کر دیا جائے اس طرح نہ تو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت محسوس کریں اور نہ ہی یہ تسلیم کریں کہ حق اس کے علاوہ بھی کہیں اور ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی الہامی دستور یعنی قرآنِ مجید میں یہود و نصاریٰ کی حالت کا جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ ہمارے لیے سامانِ عبرت ہے، کہ کس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رسی کو چھوڑ کر اپنے الگ الگ رہبان و احبار اور لیڈروں کی بے جا عصبیت میں گرفتار ہوتے ہوئے اختلافات اور تعصبات کی راہ کو اختیار کر لیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہر گروہ نے اپنے اپنے علماء اور اماموں کو شریعت ساز سمجھ لیا اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دستور سے انکار پر کمر بستہ ہو گئے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ!" (التوبۃ: ۳۱)

کہ "انہوں نے اپنے اپنے عالموں اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا۔"

اللہ تعالیٰ نے جو روشنی اور ہدایت ان کو عطا کی تھی، وہ اس سے منہ موڑ کر اس سے محروم ہو گئے۔ اور وہ ہدایت جو کہ ان کے اختلافات کو مٹانے اور جھگڑوں کو چکانے والی تھی، اس سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر جو بھی اختلاف اور تعصب رُونما ہوا، تا قیامت اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور یوں دنیا میں ذلّت اور خواری ان کا مقدر بن کر رہ گئی:

"وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ!" (البقرۃ: ۶۱)

کہ "ان پر ذلّت اور محتاجی جما دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔"

آج ہم بھی ایسے ہی اختلافات اور تعصبات سے دوچار ہیں۔ حالانکہ ہمیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورے اخلاص کے ساتھ یہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اندر یہ اختلافات کیونکر پیدا ہوئے ؟ کیا اس کی وجہ یہی تو نہیں کہ ہم نے شریعت کی اصل راہ کو چھوڑ کر اپنے لیے الگ الگ راہیں متعین کر لی ہیں ؟

اور پھر یہ کہ یہ اختلافات مبنی بر حقیقت ہیں یا یہ محض عملِ صالح سے انحراف کی بنا پر پیدا ہوئے ہیں ؟ نیز یہ کہ ہمارے دین میں ان اختلافات کو قائم رکھنے کی گنجائش موجود بھی ہے یا نہیں ؟ اور اختلافات کو باقی رکھنے میں کیا قباحتیں ہیں ؟ جن کی بنا پر اسلام سے بغض رکھنے والوں کو یہ زہر اُگلنے کا موقع ملا ہے کہ موجودہ فقہی اختلافات کی موجودگی میں کسی مشترک لائحہ عمل کا اپنانا اسلام کے نام لیواؤں کے لئے سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حکومتی سطح پر بعض شرعی قوانین کے نفاذ کے بعد جو حوصلہ افزاء نتائج برآمد نہیں ہوئے اس کی وجہ بھی انہی اختلافات کو قرار دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں مرکزی مجلسِ شوریٰ کے چیئرمین نے بھی اسلامی قوانین کے بارے میں اسی قسم کے خدشات کا اظہار کیا ہے۔

لیکن یہ بات بطورِ دعویٰ کہی جا سکتی ہے کہ شریعتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں پائے جانے والے فقہی اختلافات کی نوعیت اس درجہ ہرگز پیچیدہ نہیں ہے کہ انہیں دُور کر کے کوئی لائحہ عمل اختیار نہ کیا جا سکے۔ ان اختلافات کو شریعت کی عملداری کے خلاف دلیل بنانا مبنی بر حقیقت نہ ہے۔ بلکہ یہ ایک لحاظ سے اسلامی اصولوں کی وسعت کی دلیل بن سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہر مکتبِ فکر وسعتِ قلبی اور وسعتِ نظر سے کام لے اور ساتھ ہی حکومت بھی ان اختلافات کو ان کی جائز حدود کے اندر رکھنے کا انتظام کر کے ان کو مزید بڑھنے کا موقع نہ دے۔ جس کا واحد طریق کار یہ ہے کہ ملک میں صحیح اسلامی حکومت جلد قائم ہو۔

فقہی اختلافات کے اس اجمالی تذکرہ کے بعد ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اُمتِ مسلمہ، خصوصاً پاکستان کے اصحابِ فکر و نظر کے ہاں اس سلسلہ کے کتنے نقطہ ہائے نظر مروّج ہیں تاکہ ہم اپنے علم و تحقیق کی حد تک کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ سکیں جو ہمیں کسی مشترک لائحہ عمل تک پہنچا سکے۔

پاکستان میں پائے جانے والے فرقوں اور فقہوں کی روشنی میں ہمیں کم از کم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سارے مختلف نقطہائے نظر سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے علمائے جاریہ کے نقطہ نظر پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ پہلا نقطہ نظر یہ ہے کہ فقہی اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے قانون سازی کی کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس میں تمام فرقوں کی پوری رعایت اور ان کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اس فکر کے حاملین کے نزدیک مسلمانوں کے باہمی اختلافات دراصل فکرو رائے کے اختلافات ہیں، جن کا تعلق فہم انسانی سے ہے اور چونکہ قدرت نے تمام انسانوں کو ایک جیسے فہم اور عقل سے نہیں نوازا، اس لئے ہر انسان کا اندازِ فکر مختلف ہے جو کہ ایک فطری امر ہے۔ لہٰذا اسے مختلف رائے رکھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اور پھر یہی اندازِ فکر اور فہم کا یہ اختلاف شریعت میں فقہی اختلافات کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر کے مطابق اگر کوئی ان اختلافات کو ختم کرنا چاہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تمام انسانوں کو عقل سے محروم کر دیا جائے تاکہ ہر معاملہ میں غور و فکر کو چھوڑ کر ہاں میں ہاں ملانے والوں کی ایک بھیڑ اکٹھی کر لی جائے۔

اس نقطہ نظر کے حاملین کے نزدیک اسلامی قانون کی عملداری کی ایک ہی قابلِ عمل شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ اختلافات کو قانوناً تسلیم کر کے اس طرح قانون سازی کی جائے کہ اس میں تمام فرقوں، مسالک اور مکتب ہائے فکر کے لیے مکمل رعایت موجود رہے۔ اور یہ کام عملی لحاظ سے بھی کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اس موقف کی حمایت میں کراچی میں منعقد ہونے والے اکتیس علماء کے تاریخ ساز اجتماع کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں شیعہ، سُنّی، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، ہر مکتب فکر کے مستند علمائے دین شامل تھے۔ اور انہوں نے متفقہ دستوری سفارشات مرتب کر کے یہ ثابت کیا کہ ان سب فرقوں کے باہمی اختلافات صرف قانونی جزئیات سے متعلق ہیں۔

اس نقطہ نظر کے سب سے بڑے مؤید مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم رہیں۔ ہم ان کی رائے اُن کے اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> "جہاں تک پرسنل لاء کا تعلق ہے۔ ہر فرقے پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو اس فرقے کے نزدیک مُسلّم ہیں۔ اور جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے، وہ اکثریت کے مسلک کے مطابق ہوں گے"۔ (تفہیمات حصہ سوم ص ۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نقطہ نظر کی حمایت میں سپریم شرعی عدالت پاکستان کے جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی رائے بھی قابلِ غور ہے:

"ملک کا عام قانون تو اس فرقے کے مسلک کے مطابق بنایا جائے، جس کے افراد یہاں زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اور دوسرے فرقوں کے لئے الگ شخصی قوانین بنائے جائیں جو ان کے لئے قابلِ عمل ہوں۔" [1]

آگے جا کر لکھتے ہیں:

"ملک میں عام قانون تو سُنّی حنفی مسلک کے مطابق ہو گا، کیونکہ ملک میں اسی مسلک کی اکثریت ہے۔ دوسرے فرقوں میں جس فرقہ کے نظریات اس سے مختلف ہوں گے، اس کا شخصی قانون علیحدہ بنا دیا جائے گا۔"

اب جہاں تک اختلافات کے فطری اور انسانی ہونے کا تعلق ہے، اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ لیکن فقہی اختلافات کے نقطہ نظر سے جس دلیل کے تحت ان اختلافات کو ضروری اور فطری قرار دیا جا رہا ہے اور سب کو اس کا حق بخشا جا رہا ہے، اکثریتی فقہ کو دوسرے فرقوں پر بالادستی عطا کر کے، خود یہ دلیل اپنے خلاف استعمال کی جا رہی ہے۔ گویا اکثریتی فرقہ کو تو فکر و نظر کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن اقلیتی فرقے ملک کے عام دستور و قانون میں کسی طرح سے دخیل ہونے کے مجاز نہیں ہیں۔ اور اس طرح ملک میں سارے اقلیتی فرقوں کو اختلافِ رائے کے فطری حق سے خود ہی محروم بھی کر دیا ہے۔

مزید برآں اکثریتی فرقہ کی فقہ —— ہمارے ملک میں فقہ حنفی —— پر مبنی جو دستور و قانون وضع کیا جائے گا، وہ اس لیے مزید اختلافات کا باعث بنے گا کہ اُس میں پہلے سے بیسیوں ایسے دھڑے موجود ہیں جو بہت سے امور پر ایک دوسرے سے اختلافات رکھتے ہیں۔

چونکہ تغیرِ احوالِ زمانہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور فطری اور انسانی عقل کے اختلافات بھی فروعی اور اجتہادی مسائل میں اختلاف کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے

---

[1] عصرِ حاضر میں اسلام کیسے نافذ ہو؛ صفحہ نمبر ۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی بھی متفق علیہ دستور و قانون کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اور پھر اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں مختلف فرقوں اور فقہوں کی اکثریت ہے۔ اس صورت میں اگر اکثریت کو ہی معیارِ حق مان لیا جائے تو عالمِ اسلام میں بیک وقت کئی دساتیر و قوانین کا منظرِ عام پر آجانا ایک بدیہی بات ہے۔ اندریں حالات مختلف ملکوں میں مختلف فقہوں پر مبنی دساتیر و قوانین کو کتاب و سنت کا بدل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ اختلافات اصولوں کی حد تک بڑھ گئے ہوں۔ اور ہر ایک کا دعویٰ یہ ہو کہ وہی حق پر ہے۔

دراصل حق و صداقت تک پہنچنے کے لیے اکثریت کی رائے کو آخری قانون اور معیار قرار دینا ہمارے دینِ فطرت کی رُوح کے ہی خلاف ہے۔

۲۔ دوسرے نقطہ نظر میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ملک کا عام قانون تو کتاب و سنت پر مبنی ہو اور اس میں کسی فقہ کی پابندی لازمی نہیں ہونی چاہیے۔ جب کہ شخصی قانون ہر ایک فرقہ کی فقہ پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق جہاں تک شخصی قانون اور اس قانون کی فقہی اصطلاحات (جن میں عبادات، مناکحات طلاق، وراثت وغیرہ شامل ہیں)، کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں چونکہ مذہبی ذہن بڑے حساس ہوتا ہے، اس لیے اس معاملہ میں سارے فرقوں کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں ملک کے عام قانون کو ہر فرقہ اور فقہ سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اور وہ صرف کتاب و سنت پر مبنی ہو، اور اس میں کسی بھی فقہ کی تخصیص نہ ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس نقطہ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں:

"کسی فقہ کا سرے سے کوئی تعین نہیں ہونا چاہیے۔ کتاب و سنت، یہ ہماری دو بنیادیں ہیں۔ ہمارے کلمہ کے اجزاء دو ہی ہیں؛

"لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

ایک کا قائم مقام قرآن ہے اور دوسرے کا قائم مقام سنت ہے، جو زندہ و پائندہ ہے۔ ان دو پر ہمارا نظام چلے گا۔" [1]

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب خصوصی طور پر حضرت عمرؓ کے دور کی مثال

[1] رپورٹ تجاویز و تقاریر علماء کنونشن منعقدہ ۱۹۸۰ء صفحہ نمبر ۶۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیش کرتے ہیں جب کہ کسی قانون کی بنیاد سوائے کتاب و سنت کے نہ تھی۔

اور اگر اس دور میں کوئی دلیل تھی تو وہ کتاب و سنت ہی تھی۔ جب کہ کوئی فقہ اس کی دلیل نہ تھی۔ بہر حال اس نقطۂ نظر کے حاملین کو اصرار ہے کہ ہر فقہ و فرقہ سے بالا تر ہو کر قوانینِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید کی جائے، تاکہ ہر مکتبِ فکر کی تسلی و تشفی ہو سکے۔

یہ نقطۂ نظر جن دو بنیادوں پر استوار ہے، وہ ساری امتِ مسلمہ میں متفقہ ہیں۔ اور مسلمانوں کے تمام مکتبِ فکر کو ان پر مکمل اتفاق ہے۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو کہ اس وقت فتنۂ انکارِ حدیث کھڑا کیے ہوئے ہیں۔ لیکن جہاں تک کتاب و سنت پر مبنی ایک متفقہ دستور کی تدوین کا تعلق ہے، اس میں ایک واضح اشکال یہ ہے کہ ہم جو بھی دستور و قانون تیار کریں گے اس کی اصطلاحی حیثیت ایک فقہ ہی کی ہو گی۔ جو اگرچہ کتاب و سنت پر مبنی ہو گی (کیونکہ کتاب و سنت کے فہم کا نام ہی فقہ ہے) لہٰذا یہ پہلی فقہوں میں ایک اور اضافہ ہو گا۔ تو پھر اس میں فقہ سے بالاتر کیونکر رہا جا سکتا ہے؟

علاوہ ازیں دستور و قانون کی تدوین میں فہم کے اختلاف کا رُونما ہونا ایک فطری امر ہے۔ اور فہم کا اختلاف آج کا مسئلہ نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ اور بعد کے ادوار میں بھی اس سے سابقہ درپیش آتا رہا ہے۔ ایسے میں کسی متفقہ دستور کی تدوین کیونکر ممکن ہو گی؟ اس طرح تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ اسلاف کے فقہی سرمایہ کے ساتھ ساتھ فقہ جدید کے اختلافات کے اضافہ سے مزید انتشار پیدا ہو گا۔ کتاب و سنت کے فہم کو دستوری حیثیت دینے سے یہ سوال بھی پیدا ہو گا کہ اس سے پہلے موجود فہم کو آخر کیوں دستوری حیثیت نہیں دی جا سکتی؟

اسی طرح فہم کے اختلاف میں تعدد بھی ایک لازمی امر ہے ——— اور متعدد آراء کے ہونے سے نہ صرف دستوری انتشار پیدا ہو گا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو دستور اختلاف و انتشار کا شکار ہو، وہ کسی طور بھی ایک پائیدار دستور ثابت نہیں ہوتا۔ مزید برآں جو لوگ اس دستور و قانون سے اختلاف کریں گے وہ اس چیز کو بطورِ دلیل پیش کریں گے کہ اگر صحابہ کرامؓ اور ائمہ سلف کے درمیان فہم کے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے، تو یہ دستور کوئی الہامی تو نہیں ہے کہ اس سے کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش موجود ہی نہ ہو۔

اور جہاں تک ہر فرقہ کو شخصی قوانین میں آزادی دینے کا تعلق ہے، تو شخصی قوانین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں مکمل آزادی کا مطلب یہ ہوگا کہ فروعی اور فقہی اختلافات کی اجازت دے کر گویا دستوری سطح پر اسلام میں فرقہ بندی کے جواز پر مہر تصدیق ثبت کردی گئی ہے، حالانکہ کسی چیز کی موجودگی بالکل اور چیز ہے لیکن اسے دستوری اور قانونی جواز مہیا کرنا اور بات! یہ تو کسی شے کے نفع وضرر سے قطع نظر اُسے قانونی تحفظ مہیا کرنا ہے۔

مزید یہ کہ عبادات اسلام میں پوری زندگی کی بنیاد ہیں۔ جنہیں انفرادی معاملہ قرار دینا غلط ہے۔ اور پھر عبادات میں انفرادیت کو اجتماعیت سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے نماز انفرادی عبادت کے علاوہ پوری معاشرتی زندگی کی بنیاد بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مردوں کی اکیلے نماز کوئی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ نماز باجماعت ضروری ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ معاشی زندگی کی بنیاد ہے، اور اس کو اجتماعی سطح پر اکٹھا کرنا اور تقسیم کرنا مستحسن بھی ہے اور اس نظام کا تقاضا بھی! یہی حال دیگر عبادات کا ہے۔ گویا اسلام میں جو چیزیں بظاہر انفرادی نظر آتی ہیں ان میں بھی انفرادیت کو اجتماعیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ نیز عائلی زندگی معاشرہ کی پہلی وحدت ہے۔ اور عائلی نظام کو انسان کا انفرادی معاملہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ گویا کہ اسلام نے زندگی کو ایک وحدت کی صورت میں لیا ہے اور کتاب وسنت کی صورت میں ایک مکمل نظام دیا ہے۔ لہٰذا زندگی کو مختلف نظاموں کی صورت میں تقسیم کرنا اسلامی تصورات کے منافی ہے۔

پس عام قانون اور شخصی قانون کی یہ تقسیم اس مغربی تصور کی حمایت ہو گی کہ اسلام میں مذہب وسیاست الگ الگ ہیں۔ حالانکہ:

ع۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

۳۔ تیسرا نقطہ نظر ملک کے ایک معروف عالم دین جناب امین احسن اصلاحی صاحب کا ہے۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ایک صحیح اسلامی ریاست کسی متعین امام کی تقلید اور کسی متعین فقہ کی پیروی کے اصول پر قائم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ لازم ہے کہ اس کی بنیاد براہِ راست کتاب و سنت اور اجتہاد وشوریٰ پر ہو۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری فقہ اسلامی بلا کسی استثناء و امتیاز کے اُس کا سرمایہ ہے۔ اور تمام اجتہادی امور میں کسی تخصیص وترجیح کے بغیر مختلف ائمہ کے اجتہادات پر نگاہ ڈال کر اپنے قوانین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ان اقوال اور رایوں کا انتخاب کرے جو اس کی نظر میں کتاب وسنت اور روحِ اسلام سے قریب تر نظر آئیں .... عین ممکن ہے، آج سابق ائمہ میں سے کسی کے کسی قول کو قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ لیکن کل دلائل کی قوت واضح ہونے کے بعد اس کی جگہ کسی اور کے قول کو اختیار کر لیا جائے۔"[1]

تدوینِ قانون کے بارے میں اظہارِ خیال فرماتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

"اجتہادی معاملات میں اسلام نے ہمیں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی پیروی کی ہدایت نہیں کی ہے۔ بلکہ اس اجتہاد کی پیروی کی ہدایت کی ہے جو کتاب وسنت سے زیادہ موافقت رکھنے والا نظر آئے۔ اسی چیز کی تاکید ان بزرگ ائمہ نے فرمائی ہے۔ اگر ہم تدوینِ قانون کے معاملہ میں یہ روش اختیار کریں گے۔ تو اس کے کئی فائدے ہوں گے۔"[2]

کتاب وسنت اور اجتہاد رائے کا باہمی تعلق بیان کرتے ہوئے مولانا رقمطراز ہیں:

"جس طرح سنت کتابِ الٰہی سے کوئی الگ چیز نہیں اسی طرح اجتہادِ رائے بھی کتابِ الٰہی اور سنت سے کوئی علیحدہ شے نہیں ہے۔ اجتہادِ رائے سے مراد یہ ہے کہ پیش آنے والے معاملات کے بارے میں قرآن یا سنتِ رسول اللہؐ کی رہنمائی میں غور کر کے یہ طے کرنا کہ ان میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ سے لگتی ہوئی بات کیا ہو سکتی ہے۔"[3]

اس نقطۂ نظر کے جائزہ سے پہلے ہم اس بنیادی بات کو واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ کتاب وسنت کی عصمت کسی شک وشبہ اور تغیر وتبدل سے بالاتر ہے۔ جبکہ اجتہاد ورائے خود مولانا صاحب کے نزدیک بھی کسی لحاظ سے اٹل اور دائمی حیثیت نہیں رکھتے۔ خود ان کے اپنے الفاظ ہیں:

"پچھلے ائمہ کے جو اقوال انتخاب کیے جائیں گے، ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں بھی ہو سکیں گی۔ یہ عین ممکن ہے کہ سابق ائمہ میں سے کسی کے کسی قول کو آج قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ لیکن کل دلائل کی قوت واضح ہونے کے بعد اس کی جگہ کسی دوسرے قول کو اختیار کر لیا جائے۔"

---

[1] فقہی اختلافات: ص صفحہ ۹۸ [2] اسلامی قانون کی تدوین صفحہ ۸۱ [3] فقہی اختلافات: صفحہ ۲۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لہٰذا ان کا یہ قول محلِ نظر ہے کہ اجتہادِ رائے بھی کتاب الٰہی اور سنت سے کوئی علیحدہ شے نہیں۔ حالانکہ ہر خاص وعام پر یہ بات واضح ہے کہ:

(ا) کتاب وسنت الہامی چیزیں ہیں جن کی حفاظت اور عصمت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (الحجر: ۹)

کہ "بیشک ہم نے ذکر (کتاب وسنت) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔

لہٰذا شریعت (کتاب وسنت) غیر متبدل ہے، جبکہ اس کے برعکس کسی عالم دین کا اجتہاد اور شوریٰ کی رائے محض انسانی بصیرت پر منحصر ہے جو احوال وظروف زمانہ کے تغیر و تبدل سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

(ب) سنت کا اطلاق (APPLICATION) جس طرح پہلے زمانے کے لوگوں پر تھا اسی طرح موجودہ دور اور آئندہ مسائل پر بھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی حیثیت علی الاطلاق کی ہے اور علی العموم کی بھی۔ جبکہ اجتہاد میں اس طرح کی کسی قطعیت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

(ج) نبی معصوم ہوتا ہے اور سنت نبویؐ معصوم کے عمل سے عبارت ہے جبکہ اجتہاد ایک غیر معصوم امتی کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہوتا ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے، صحیح بھی! دونوں میں بحیثیت کیفیت وکمیت زمین و آسمان کا فرق ہے، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کا مترادف قرار دینا ایک بہت بڑا فقہی مغالطہ ہے۔

(د) اجتہاد کی اثر پذیری زمان ومکان اور افکار واذہان کے تحت مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ جب کہ سنت رسول اللہؐ اس طرح کے کسی تغیر وتبدل سے محفوظ ہے۔ اس لیے سنت کی حیثیت تو دستوری ہے اور اجتہاد کی حیثیت عبوری! —— سنت اٹل اور قطعی ہے۔ لیکن اجتہاد کا دائرہ صرف تشریح وتعاون کی حد تک ہے۔

(ہ) اس نقطۂ نظر میں اصل مغالطہ یہ ہے کہ سنت اور اجتہاد میں وہی تعلق بنایا گیا ہے جو سنت رسول اللہ اور قرآن کریم میں ہے۔ حالانکہ سنت کی حیثیت قرآن کے بیان کی ہے۔ چونکہ قرآن محفوظ عن التغیر والتبدل ہے، اس لیے اس کا بیان بھی معصوم عن الخطاء نبیؐ سے منسوب ہے۔ گو نبیؐ بھی اجتہاد کرتا ہے لیکن اس کا اجتہاد وحی کے مترادف ہے، اِلّا یہ کہ اس اجتہاد کی غلطی خود اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے واضح نہ کر دیں۔ گویا نبیؐ کے ارشادات اور اجتہادات ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کامل، اکمل اور قطعی و دائمی شریعت قرار پاتے ہیں۔ جب کہ امت کے علماء حتیٰ کہ صحابہ کرامؓ کا اجتہاد بھی، شریعت کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ تکمیلِ شریعت کے بعد عالم کے فہم کی حیثیت ایسی نہیں کہ اس پر مبنی آراء کو دستوری و قانونی حیثیت دے دی جائے۔

البتہ ایک اشکال پریشانی کا سبب بنتا ہے۔ اور وہ یہ کہ شریعت کی تعلیمات جملہ پیش آمدہ مسائل کا احاطہ نہیں کرتیں، اس لیے اجتہاد کی ضرورت ہر دور میں مسلمہ ہے۔ حالانکہ صحیح فکر یہ ہے کہ شریعت اپنے اندر تا قیامت پیش آنے والے جملہ مسائل کے سلسلے میں کم از کم اصولی حد تک مکمل تعلیمات رکھتی ہے[1] اور دستور کے لئے اس حد تک مکمل ہونا کافی ہے۔ لہٰذا اجتہاد کو دستوری حیثیت دینا ضروری نہ ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں کچھ ایسے مسائل سے سابقہ آن پڑے کہ جن کا حکم بظاہر منصوص نہ لگتا ہو۔ لیکن غور و فکر سے ان کا تعلق کتاب و سنت کی کسی نہ کسی نص سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

سنتِ رسول اللہ کا کام قرآنِ مجید کی تعلیمات کی عملی شکل پیش کرنا ہے، جو کہ اس معنی میں حجت ہیں۔ جب کہ عالمِ دین کا کام کتاب و سنت کا سمجھنا اور اس کا فہم حاصل کرنا ہے۔ ہم نے کتاب و سنت کا باہمی ربط اور اجتہاد کی اُن سے نسبت کو جس طرح بیان کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اس کا اعتراف کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

"اجتہاد خواہ کتنے ہی بڑے آدمی کا ہو، غلطی اور صحت دونوں ہی باتوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مجتہد اگرچہ اپنی ذات کی حد تک اپنے اجتہاد کا پابند ہوتا ہے لیکن وہ دوسروں پر نہ تو اس کو واجب کر سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے اجتہاد کو نصوص کا درجہ دے کر اس کی بنا پر دوسروں سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں۔"[2]

---

[1] امام ابن تیمیہؒ کا اس موضوع پر مشہور رسالہ "مَعَارِجُ الْوُصُوْلِ اِلٰی مَعْرِفَۃِ اَنَّ اُصُوْلَ الدِّیْنِ وَفُرُوْعَہٗ قَدْ بَیَّنَہَا الرَّسُوْلُ" ہے۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کے جملہ اصول و فروعات واضح طور پر بیان کر دیے ہیں۔ جو دراصل ترجمہ ہے اس حدیث کا کہ:

"تَرَکْتُکُمْ عَلَی الْمِلَّۃِ الْبَیْضَاءِ لَیْلُہَا کَنَہَارِہَا۔"

یعنی "میں نے تمہیں واضح اور سیدھے راستے پر چھوڑا ہے کہ جس کی رات بھی دن کی مانند ہے۔"

[2] فقہی اختلافات کا حل صفحہ ۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حرفِ مدعا یہ ہے کہ کتاب وسنت کی صورت میں شریعت کا نظریہ اور نظام اسلام مکمل طور پر پیش کر دیا گیا ہے ۔ اجتہاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس نظام کی اکملیت کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کیا جائے اور مختلف حالات میں مختلف مسائل کے لیے کتاب وسنت کی تعلیم کو عملی جامہ پہنایا جائے ۔

آخر میں ہم بجا طور پر یہ اعتراف ضرور کرتے ہیں کہ مولانا اصلاحی نے کتاب وسنت سے اجتہاد کی موافقت اور مطابقت پر جو زور دیا ہے، وہ قابلِ صد تحسین ہے ۔ ہمارا ان سے اصل اختلاف یہ ہے کہ ہم صرف اور صرف کتاب وسنت کو دستوری و قانونی حیثیت دیتے ہیں لیکن وہ اجتہاد رائے کو بھی اس کی اصل حیثیت سے بڑھا کر کتاب وسنت کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں [1]

(جاری ہے)

[1] ہم اس چیز کی مزید وضاحت آخر پر اپنے نقطۂ نظر میں پیش کریں گے ۔

خلافت و جمہوریت

دورِ حاضر کا ایک نہایت اہم مسئلہ

مغربی جمہوریت موجودہ دور کا سب سے بڑا بت ہے جس کو گرائے بغیر نفاذِ اسلام ممکن نہیں، کہ اسلامی نظامِ حیات سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، جبکہ ہم نفاذِ اسلام کے ساتھ ساتھ اس کو بھی گلے لگائے رکھنا ضروری سمجھتے ہیں

فاضلِ محترم مولانا عبدالرحمان کیلانی کے ترجمانِ کتاب وسنت اور حقیقت نگار قلم سے

قیمت ۱۵ روپے ——— مجلد ۱۸ روپے

ناشر: ادارہ محدث مجلس التحقیق الاسلامی - ۹۹ جے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

© rasailojaraid.com